قانونِ اسلامی ۔ اختصاصی مطالعہ ۲۱

اصولِ فقہ

فقہ شافعی و فقہ حنبلی

شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

قانونِ اسلامی-اختصاصی مطالعہ
اصولِ فقہ---۲۱
فقہ اسلامی کا تاریخی ارتقاء-۲

فقہ شافعی و فقہ حنبلی

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانون اسلامی ۔ اختصاصی مطالعہ

اصول فقہ ۔۔۔۔ ۲۱

فقہ اسلامی کا تاریخی ارتقاء ۔ ۲

عنوان	:	فقہ شافعی و فقہ حنبلی
مؤلف	:	ڈاکٹر محمد میاں صدیقی
نظر ثانی	:	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ادارت	:	عرفان خالد ڈھلوں
حتمی تصحیح	:	شہزاد اقبال شام
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس	:	عرفان خالد ڈھلوں
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مطبع	:	اظہار سنز پرنٹرز، ۹ ریٹی گن روڈ لاہور
سال طباعت	:	۲۰۰۳ء جون ۲۰۰۵ء
تعداد	:	۱۰۰۰ ۲۵۰۰

ISBN 969-8263-28-4

فہرست

پیش لفظ

کسی ریاست کا رائج قانون اس میں بسنے والوں کے اساسی نظریات و عقائد کا عکاس ہوتا ہے ورنہ قانون اور قوم میں اجنبیت کے باعث نہ تو قانون اس قوم میں قبولیت عام کی سند حاصل کرتا ہے اور نہ قوم اس قانون کے احترام اور پاسداری میں گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی انتشار و انتشار اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر قانون اجنبی اور مسلط کردہ ہو تو اس پر عمل جبر کے تحت ہوتا ہے اور مجبور قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ اجنبی قانون تو وہ قومیں اپناتی ہیں جو خود کسی دستور اور نظم قانون سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

مسلم امہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دستور سازی اور قانون سازی پر اس کا علمی ورثہ بہت گراں قدر ہے۔ گذشتہ ۱۳ صدیوں سے مسلمان اہل علم کی تحریریں قانون اور اصول قانون پر دنیا بھر کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، امام محمد شیبانی (م ۱۸۹ھ) اور امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کی کتابیں آج بھی روشنی کا منبع ہیں۔

امت مسلمہ کے قانونی اور دستوری نظام کے دو بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر اسلام کا قانونی نظام نہ تو اپنی صحیح شکل و صورت میں قائم رہتا ہے اور نہ ان سے فکری غذا حاصل کیے بغیر ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ پہلا بنیادی عنصر اسلامی عقائد ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان میں فکری استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ فکری استحکام ایمان و یقین کی وجہ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ صاحب ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق و صداقت کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ دوسرا بنیادی عنصر اخلاق و تزکیہ ہے۔ مکارم اخلاق کی تعلیم اور تزکیۂ نفس انسان کے کردار، مزاج اور رویے کی اصلاح کر کے اسے معاشرہ میں تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ مقام پر فائز رکھتے ہیں۔

امت مسلمہ جب تک اپنے فقہی اور قانونی ورثہ سے وابستہ رہی اس وقت تک اس کی ترقی کی رفتار بھی تیز رہی اور عالمی قیادت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہترین نمونہ بھی پیش کرتی رہی۔

لیکن جب مسلمانوں میں بنیادی عقائد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کمزور پڑ گیا اور اخلاقی اقدار میں ضعف پیدا ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور قانونی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ پھر استعماری دور میں اسلامی روایات، نظام تعلیم، قانون اور تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لیے منظم کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں برصغیر میں ملک کے اسلامی عدالتی اور تعلیمی نظام کی جگہ استعمار کے اپنے نظام نے لے لی۔ اس صورت حال نے اس پورے خطہ کو بری طرح متاثر کیا اور بتدریج ہر شعبہ میں شر و فساد سرایت کرتا چلا گیا جس کے تباہ کن اثرات سے آج ہم دوچار ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے برحق فرمایا تھا:

نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ، وَاِنِ ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِه اَذَلَّنَا اللّٰهُ

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی، اگر ہم نے عزت کو اسلام کے علاوہ کسی اور نظام حیات میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

لیکن آج مسلمانوں میں موجودہ صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ غیر اقوام کے قانون سے خود کو آزاد کرا کے قرآن و سنت کے نظامِ حیات میں دوبارہ عزت تلاش کریں۔ اسی تڑپ کے وہ مظاہر ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں عالم اسلام اور عالمِ کفر کے مابین کشمکش کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔

امت مسلمہ کو ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جن کی جدید قانونی نظریات پر تنقیدی نظر ہو اور جو فقہ اسلامی کے اصل مآخذ سے استفادہ کرنے کی دسترس رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا احکام شریعت کی اکملیت، حقانیت اور ان کے قابل عمل ہونے پر غیر متزلزل ایمان اور ان احکام کو روبہ عمل دیکھنے کی حقیقی تمنا اور لگن بھی ہو۔

ایسے رجال کار کی تیاری میں شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اپنے قیام کے روز اول سے مصروفِ عمل ہے۔ اس کام میں بیرون ملک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی قانون دان طبقوں کے تربیتی پروگراموں کے انعقاد مسلسل جاری ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبہ میں فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''سلسلہ مباحث فقیہ'' کی تیاری اور اردو اور انگریزی زبانوں میں تراجم کا کام بھی ہو رہا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کے تحت ''مطالعہ اسلامی قانون'' پر ایک ابتدائی کورس کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس ایک سالہ فاصلاتی کورس کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک ہزاروں افراد اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ہم نے اس ابتدائی کورس کے آغاز پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''ایڈوانس کورسز'' تیار کیے جا رہے ہیں اور جلد ہی ان کو شروع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے ہمارے عزم کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشا، ہماری راہیں آسان فرمائیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ اصولِ فقہ (ISLAMIC JURISPRUDENCE) میں اختصاصی مطالعہ (ADVANCE COURSE) کا اجراء کرسکیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یہ اختصاصی مطالعہ چوبیس درسی اکائیوں (UNITS) پر مشتمل اور ایک سالہ دورانیہ کا ہے۔

اسلامی قانون میں دیگر اختصاصی مطالعہ جات کی تیاری کا کام جاری ہے ہم بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اس نے جس طرح ہمیں اصولِ فقہ میں اس اختصاصی مطالعہ کو شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی طرح ہمارے دیگر منصوبوں کی تکمیل میں بھی فضلِ الٰہی شاملِ حال رہے گا۔ اِن شاء اللہ

پاکستان بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر قانونِ الٰہی کے غلبہ و قیادت کے مطلوبہ رجالِ کار کی تیاری کسی ایک ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں اُمت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اہلِ علم سے ایسی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے منصوبوں کی بہتری میں مد و معاون ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تعارف

گذشتہ درسی اکائی (UNIT) میں آپ ''فقہ اسلامی کا تاریخی ارتقاء'' کے حوالہ سے فقہ حنفی اور فقہ مالکی کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ زیر نظر اکائی فقہ شافعی اورفقہ حنبلی پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ ان دونوں کے بانیان اورمشہور فقہاء کے بارے میں ضروری آگاہی حاصل کریں گے۔ آپ یہ بھی جان لیں گے کہ فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں استنباط احکام کے لیے اصول اجتہاد کون کون سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں فقہی مسالک کے ارتقاء، ترویج اور اشاعت سے متعلق بھی بتایا جائے گا۔

یہ درسی اکائی بھی آپ کے لیے اپنے علمی فقہی ورثہ سے متعلق مفید معلومات کے حصول اور اس ورثہ سے آپ کے تعلق کو مضبوط کرنے کا باعث ہوگی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ شافعی

فقہ شافعی کے بانی امام شافعیؒ

فقہ شافعی کے بانی امام محمد بن ادریس الشافعیؒ ہیں۔ رجب ۱۵۰ھ میں امام ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی اور اسی ماہ و سن میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔ بلکہ بعض تذکرہ نگاروں نے یہاں تک کہا کہ جس روز ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی، وہی امام شافعیؒ کا یومِ ولادت ہے[۱]۔

جس طرح امام ابوحنیفہؒ کو چاروں ائمہ مجتہدین میں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے اسی طرح امام شافعیؒ کو ہاشمی النسب ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ عبدمناف پر جا کر آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ شافع آپ کے جدِ اعلیٰ تھے، شافعی انہی کی طرف نسبت ہے۔ والد ادریس تبالہ کے رہنے والے تھے جو حجاز میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مگر انہوں نے اوائل عمر ہی میں تبالہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

امام شافعیؒ کی پیدائش سے چند روز پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، اس وقت امام کی والدہ غزہ نامی ایک آبادی میں مقیم تھیں جو مصر میں عسقلان کے مضافات میں ہے[۲]۔

نشوونما۔ ابتدائی تعلیم و تربیت

امام شافعیؒ دو برس کے تھے کہ ان کی والدہ انہیں عسقلان سے حجاز لے گئیں۔ سات برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ دس برس عمر ہوئی تو آپ مؤطا امام مالکؒ زبانی یاد کر چکے تھے[۳]۔

امام شافعیؒ نے نوجوانی میں لغت اور شعر و ادب میں دسترس حاصل کی، آپ کے بہت سے اشعار اور قصائد تذکرہ نگاروں نے نقل کیے ہیں۔ کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور وہاں سفیان بن عیینہؒ اور مسلم زنجیؒ سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ امام شافعیؒ

۱۔ توالی التاسیس ص ۵۲

۲۔ حوالہ بالا ص ۵۳

۳۔ مناقب الشافعی ۱/۳۲۹

جب پہلی بار امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ امام شافعیؒ نے جواب دیا: محمد۔ امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کے سراپا پر گہری نظر ڈالی اور فرمایا: اے محمد! اللہ سے ڈرتے رہنا، ایک دن تو بڑی شان والا ہوگا۔ جب تک امام مالکؒ زندہ رہے (۱۷۹ھ تک) آپ انہی کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد عراق جا کر امام ابو حنیفہؒ کے شاگردِ خاص امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے استفادہ کیا۔ مختلف علماء سے استفادے کی خاطر حجاز، یمن، عراق، اور مصر میں بارہا اقامت پذیر ہوئے[۴]۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے جن شیوخ سے استفادہ کیا ان کی تعداد اسی (۸۰) ہے۔ ان میں امام مالکؒ کے علاوہ مشہور اور قابل ذکر حضرات یہ ہیں: مسلم بن خالد زنجیؒ (م۱۸۰ھ)، فُضَیل بن عیاضؒ (م۱۸۷ھ)، سفیان بن عیینہؒ (م۱۹۸ھ)، وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۷ھ)، یحییٰ بن سعید القطانؒ (م۱۹۴ھ)، محمد بن حسن شیبانیؒ (م۱۸۹ھ)، اسامہ بن زیدؒ (م ۱۶۶)، حماد بن سلمہؒ (م۱۶۷ھ)، حماد بن اسامہ کرنیؒ (م۲۱۱ھ) اور عبداللہ بن مبارک مروزیؒ (م۱۸۱ھ)[۵]۔

ابتداء میں امام شافعیؒ نے امام مالکؒ کے فقہی مسلک کی پیروی کی لیکن بعد میں اپنے کثرتِ علم اور وسیع تجربے کی بناء پر ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد رکھی۔

لغت، انساب، تفسیر، حدیث اور کلام میں آپ کی مہارت مسلمہ تھی۔ بحث و تمحیص، مناظرہ اور اجتہاد و استنباط میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اللہ نے ان کو اظہارِ بیان کی زبردست قدرت عطا کی تھی۔ اِن صفات و خصوصیات نے آپ میں اہل الرائے اور اہل حدیث کے طریقوں کو متحد کرنے کی پوری صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ آپ کا فقہی مسلک حنفی اور مالکی مسلک کے درمیان ہے۔ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع اور قیاس، ان چاروں مصادر سے استنباطِ مسائل کرتے تھے اور چاروں کو قابلِ استدلال سمجھتے تھے، مگر حنفیہ کے استحسان اور مالکیہ کے مصالحِ مرسلہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے آپ کے تلامذہ کی تعداد کم و بیش ایک سو ساٹھ بتائی ہے، ان میں بعض اس رتبے کے ہیں جو خود مجتہد اور صاحب مسلک ہیں۔ جیسے امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ)، امام داؤد ظاہریؒ (م۲۷۰ھ)، امام ابو ثور بغدادیؒ (م۲۴۰ھ) اور امام ابن جریر طَبَریؒ (م۳۱۰ھ)۔

ان کے علاوہ ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدیؒ (م۲۱۹ھ)، حَرملہ بن یحییٰؒ مصری (م۲۴۴ھ)، سلیمان بن داؤدؒ (م۲۱۹ھ)، حسن بن محمد زعفرانی بغدادیؒ (م۲۵۹ھ)، ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنیؒ (م۲۶۴ھ)، ربیع بن سلیمانؒ (م۲۵۶ھ) اور ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ قریشی بویطیؒ (م۲۳۱ھ) نے بھی علمی دنیا میں بلند مقام پیدا کیا[۶]۔

۴۔ مناہج الاجتہاد ص ۶۳۶

۵۔ الفقہ الاسلامی ص ۱۳۷

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: طبقات الشافعیہ الکبریٰ (سبکی)، تذکرۃ الحفاظ، (ذہبی) تہذیب التہذیب (ابن حجر عسقلانی)

ان تلامذہ کے بعد جن فقہاء نے شافعی مسلک کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ان میں زبیر بن سلیمانؒ بصری (م۳۲۰ھ)، سہیل بن محمدؒ (م۳۸۷ھ)، ابو محمد عبداللہ ابن یوسفؒ جوینی (م۴۳۸ھ)، ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادیؒ (م۴۲۹ھ)، ابوالقاسم عبدالرحمان بن محمد نورانی مروزیؒ (م۴۶۱ھ)، ابوالحسن علی بن محمد ابن حبیب ماوردیؒ (م۴۵۰ھ)، ابو اسحاق فیروز آبادیؒ (م۴۷۶ھ)، عبدالکریم ابن محمد سمعانیؒ (م۵۲۲ھ)، ابو حامد محمد غزالیؒ (م۵۰۵ھ)، فخر الدین ابن عساکر دمشقیؒ (م۶۲۰ھ)، محی الدین نوویؒ (م۶۷۶ھ)، تقی الدین ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ)، تقی الدین علی سبکیؒ (م۷۵۶ھ)، ابن دقیق العیدؒ (م۷۰۲ھ)، جلال الدین سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) اور ابن حجر مکیؒ (م۹۷۴ھ) نمایاں ہیں(۷)۔

شافعی مسلک کا سب سے بڑا مرکز مصر بنا، کیوں کہ امام شافعیؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں گزارے۔ یہیں اپنے مسلک کو رواج دیا۔ آپ کے اکثر تلامذہ اور مسلک کے پیروکار مصر ہی میں گزرے۔ ایک عرصہ تک جامعہ الازہر کے شیخ کا منصب بھی شافعی علماء کے لیے مخصوص رہا۔

اصولِ اجتہاد

زمانی ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے امام ابو حنیفہؒ کا فقہی مسلک وجود میں آیا، انہوں نے تدوینِ فقہ اور اجتہاد کا عمل کم و بیش ۱۲۲ ہجری میں شروع کیا اور ۱۴۴ ہجری میں اپنے انتقال سے چھ برس پہلے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ امام مالکؒ نے ۱۳۰ ہجری کے بعد اجتہاد و استنباط احکام کا کام شروع کیا، گویا زمانی ترتیب میں ائمہ اربعہ میں دوسرا نمبر امام مالکؒ کا ہے۔ تیسرے امام مجتہد، امام محمد بن ادریس شافعیؒ ہیں جو ۱۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد خاص امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ فقہِ امام مالکؒ اور فقہِ امام ابو حنیفہؒ سے آگاہی حاصل کی۔ اس طرح امام شافعیؒ نے اہل حدیث اور اہل رائے دونوں کے علوم کو جمع کیا اور ان کی روشنی میں ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد رکھی۔

امام شافعیؒ کے بارے میں اکثر اہل علم نے یہ بات کہی ہے کہ ”ان سے پہلے فقہ کے کوئی اصول و ضوابط نہ تھے اور نہ صحیح و غلط مسائل معلوم کرنے کا کوئی معیار تھا، نہ احادیث مختلفہ میں تطبیق دینے اور ان کے تعارض کو دور کرنے کا کوئی قانون اور طریق کار موجود تھا۔ امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان تمام امور کے لیے اصول اور قواعد و ضوابط مرتب کیے اور اصول فقہ کے نام سے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی“(۸)۔

اہلِ علم کا یہ دعویٰ ایک حد تک بجا اور درست مگر یہ نہیں کیا جا سکتا کہ امام شافعیؒ سے پہلے اصول اور قواعد و ضوابط کا وجود ہی نہ تھا۔ جب کہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شافعی سے پہلے تدوینِ فقہ اور اجتہاد و استنباط کا عمل بنیادی طور پر مکمل ہو

۷۔ وفیات الاعیان ۲/۲۶، ۵۲، ۶۹، ۱۵۲

۸۔ تاریخ بغداد ۳/۳۴۴

چکا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام ابن ابی لیلیٰؒ (م ۱۴۸ھ)، امام لیث بن سعدؒ (م ۱۷۵ھ)، امام سفیان ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) اور امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ سے پہلے فقہ و اجتہاد کی مسند پر فائز ہو چکے تھے۔ جن ادلہ اور مصادر سے ان حضرات نے استفادہ کیا اور استنباطِ احکام کے لیے ان کو مآخذ و مصادر بنایا، امام شافعیؒ ان میں اضافہ تو کجا ان سب سے فائدہ بھی نہ اٹھا سکے اور کئی مآخذ و مصادر سے استفادے سے انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ان حضرات نے نہ بے دلیل اجتہاد کیا اور نہ اصول وضوابط کے بغیر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قیاس، مصالح مرسلہ اور استحسان میں بطور خاص قدیم فقہاء نے پرمغز بحثیں کیں، ان کے اصول و قواعد بیان کیے، صحت اور انعقاد کی شرائط وضع کیں اور اس امر کا تعین کیا کہ وہ کون سا مرحلہ ہوگا جب کسی مجتہد اور فقیہ کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوگا کہ وہ قیاس، مصلحتِ مرسلہ اور استحسان سے کام لے سکتا ہے۔

حقیقت پسندانہ بات یہ ہے کہ اس حد تک بنیادی اور اساسی قواعد موجود تھے جن کی مدد سے اجتہاد کیا جا سکتا تھا لیکن وہ مہذّب و مرتب یا کتابی صورت میں نہ تھے۔ امام شافعیؒ نے ان کو مربوط و منظم کر کے کتابی شکل دی۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فقہ کے اصول و قواعد تو تھے مگر اس وقت تک فقہ کو ایک علم اور فن کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ امام شافعیؒ نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد و استنباط کے صرف بنیادی اور اساسی قواعد تھے، ذیلی اور تفصیلی قواعد نہ تھے، وہ امام شافعیؒ نے مرتب کیے۔ امام شافعیؒ نے انہیں ابواب وفصول میں تقسیم کیا، ان کے مراتب کا تعین کیا، قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے استدلال کی شرطیں مقرر کیں، ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید اور عام و خاص کی بحثیں قائم کیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف "الرسالة" میں خود اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں نے حنفی اور مالکی مسلک کے اصول و فروع دیکھ کر اور ان کے تمام کلیات و جزئیات پر نظر کر کے از سرنو اصول و قواعد کو مرتب کیا اور ان میں جہاں کمی پائی یا اجمال دیکھا، اسے مکمل کر دیا[(۹)]۔

امام شافعیؒ نے اپنے اصولِ اجتہاد اپنی دو مصنفات "الرسالة" اور "الأُمّ" میں بیان کیے ہیں۔ ان کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ کتاب اللہ

وہ کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم کو قطعی حجت اور تمام شرعی احکام وقوانین کا مصدر اول مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت تک قرآن کے ظاہر پر عمل اور اس سے استدلال ضروری ہے جب تک کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جس کی بنیاد پر ظاہری معنی کو چھوڑ کر اس کا کوئی دوسرا مفہوم ومنطوق مراد لیا جائے۔

۲۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب اللہ کے بارے میں کسی مجتہد کی دو رائے نہیں ہوئیں۔ بلاشبہ کتاب اللہ اسلامی قوانین کا مصدرِ اول ہے۔ اسی،

۹۔ الرسالہ ص ۶۸

طرح سنت کے بارے میں بھی کوئی فقیہ و مجتہد تردد کا شکار نہیں ہوا۔ یقیناً سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی قوانین کے مصدر ثانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

البتہ اسناد کے نقطۂ نظر سے حدیث کی جو مختلف اقسام ہیں، ان کے حوالہ سے مجتہدین کی آراء اور نقطہ ہائے نظر میں جزوی اور فروعی اختلاف ہے۔

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر

کتاب اللہ کے بعد وہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسے مصدر تشریع قرار دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اس بات کی بار بار تصریح کی ہے کہ اگر ان کی رائے مخالف حدیث ہو تو یہ حدیث سے لاعلمی کی بنا پر ہو سکتا ہے، ورنہ حدیث معلوم ہو جانے کے بعد وہ ہر حال میں اس حدیث کو اپنی رائے کی بنیاد بنائیں گے۔ امام شافعیؒ نے اپنے اصحاب کو بھی یہ کہا کہ اگر وہ امام شافعیؒ کی کوئی رائے حدیث کے خلاف پائیں تو اسے ترک کر دیں اور حدیث پر عمل کریں اور حدیث کے مقابلے میں ان کی رائے کو اہمیت نہ دیں[10]۔

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر تفصیل اور تجزیے پر مبنی ہے۔ اس کا مجمل مختصر خاکہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا عمل یہ ہے کہ اگر ایک ہی معاملے میں ایک سے زائد روایتیں ہیں، ایک روایت میں الفاظ کم ہیں اور دوسری روایت میں الفاظ زیادہ ہیں اور زیادہ الفاظ والی روایت کے راوی کم الفاظ والی روایت کے راویوں سے زیادہ معتبر و مستند نہیں ہیں تو وہ اس زیادتی کو قبول نہیں کرتے۔

۲۔ دو حدیثوں یا چند احادیث میں اگر باہمی تعارض ہو تو امام شافعیؒ دیکھتے ہیں کہ راوی کیسے ہیں اور کس روایت میں زیادہ محتاط اور بلند پایہ راوی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں امام زہریؒ کے دو مشہور شاگرد ہیں، امام مالکؒ اور امام شعیب بن ابی حمزہؒ، ایسی صورت میں وہ امام مالکؒ کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

۳۔ دو متعارض روایتوں میں اگر تطبیق ممکن نہیں ہوگی تو جو روایت طریقۂ سند میں بلحاظ کثرت و شہرت ممتاز ہوگی، اسے قبول کیا جائے گا۔

۴۔ اگر دو روایتوں میں سے ایک کے راوی متفق علیہ ہیں اور دوسری کے مختلف فیہ تو اس روایت کو ترجیح دی جائے گی جس کے راوی متفق علیہ ہیں۔

۵۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ کس راوی نے اپنے شیخ سے پختگی عمر میں روایت لی ہے اور کس نے کم سنی میں۔ پختگی عمر میں روایت لینے والے کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۰۔ الامام الشافعی ص ۳۱۹

۶۔ اگر ایسی دو روایتیں ہوں جن میں سے ایک پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عمل ہوتا رہا ہو اور دوسری روایت ایسی ہو جس پر ان کے دورِ خلافت میں عمل نہ ہوا ہو تو پہلی روایت کو ترجیح دی جائے گی اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔

۷۔ جس طرح کتاب اللہ کے بارے میں امام شافعیؒ کا اصول یہ ہے کہ ظاہری معنی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مفہوم اختیار کرنے کی جب تک کوئی مضبوط دلیل نہ ہو، اس وقت تک ظاہری معنی مراد لیے جائیں گے۔ حدیث کے بارے میں بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیشہ اپنے ظاہری معنی پر محمول کی جائے گی۔ اگر اس میں ایک سے زائد معانی کا احتمال ہے تو پھر وہ معنی مراد لیے جائیں گے جو عرب کے محاورے کے مطابق ہوں گے۔

۸۔ حنفی اور مالکی فقہاء حدیث مرسل اور حدیث منقطع سے استناد کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے یہ اصول وضع کیا کہ ایسی احادیث پر بعض مخصوص شرائط کے ساتھ عمل کیا جائے گا، مطلقاً ان سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔

۹۔ حدیث مرسل (۱۱) کو قبول کرنے کے بارے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ وہ صرف ان کبار تابعین کی مراسیل قبول کرتے ہیں جنہوں نے بہت سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض کیا ہو یا اس مرسل حدیث سے ملتی جلتی حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند کے ساتھ مامون حفاظ حدیث نے روایت کی ہو یا اس کی تائید کسی دوسری مرسل حدیث سے ہوتی ہو جسے اہلِ علم نے دوسری سند کے ساتھ قبول کیا ہو یا کسی صحابی کا قول اس مرسل حدیث سے موافقت رکھتا ہو یا اگر اہل علم کی کچھ جماعتیں کسی مرسل کے مطابق فتویٰ دیتی ہوں تو اس مرسل کو تسلیم کیا جائے گا اور یہ قبول مرسل کا آخری درجہ ہوگا (۱۲)۔

۱۰۔ ان کی رائے ہے کہ اگر اقوالِ صحابہؓ کسی حدیث کے خلاف ہوں تو حدیث پر عمل کیا جائے گا اور اقوال صحابہؓ کو رد کر دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اقوالِ صحابہؓ کا مرتبہ کتاب و سنت اور اجماع کے بعد لیکن قیاس پر مقدم ہے۔ اختلاف کی صورت میں خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کے قول کو مقدم رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ صورت میں اس صحابی کا قول اختیار کیا جائے گا جس کا قول کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہو۔ اگر کسی صحابی کے قول کے خلاف دوسرے صحابی کا کوئی قول نقل نہ ہو تو اسے مانا جائے گا (۱۳)۔

۱۱۔ فقہاء کے درمیان یہ معاملہ مختلف فیہ رہا ہے کہ کیا کوئی حدیث صحیح، قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ کوئی بھی حدیث قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔

۱۱۔ حدیث مرسل وہ حدیث ہے جس کی سند تابعی پر ختم ہو جائے اور اس صحابی کا ذکر نہ ہو جس سے وہ تابعی روایت کر رہا ہے۔

۱۲۔ الامام الشافعی ص ۳۷۷

۱۳۔ حوالہ بالا ۳۵۰ ومابعد

خبرِ واحد کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر

امام شافعیؒ خبرِ واحد سے استدلال میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے مگر شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس کا راوی ثقہ اور معتمد ہو، حفظ اور صدق میں اچھی شہرت رکھتا ہو، ناقدین حدیث نے اسے کبھی کذب اور تدلیس سے متہم نہ کیا ہو اور سند بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ راوی جو حدیث بیان کر رہا ہے اس کا مفہوم وہ اچھی طرح سمجھ رہا ہو، راوی جس راوی سے حدیث کی روایت کر رہا ہے اس سے خود اس نے براہ راست سماعت کی ہو اور اہل علم کی حدیث سے یہ حدیث مخالف نہ ہو۔

خبر واحد میں اگر یہ تمام شرائط پائی جاتی ہوں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی حدیث مشہور مضمون اور معنیٰ کے اعتبار سے اس کی مؤید ہے یا نہیں[۱۴]۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ خبر واحد کی قبولیت میں اس قسم کی شرطیں لگاتے ہیں۔ خبر واحد کے قبول کرنے میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ کی طرح یہ شرط بھی نہیں لگاتے کہ اہل مدینہ کا عمل اس کے مطابق ہو[۱۵]۔

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا یہ طرزِ عمل منصفانہ اور عقلی ہے کہ صحیح اور متصل روایت خواہ وہ مدینہ کی ہو یا کوفہ کی، یا کسی اور علاقے کے راویوں سے پہنچی ہو، اگر اس کی سند قوی اور قابلِ اعتماد ہے تو اسے قبول کیا جائے گا۔

۳۔ اجماع کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر

کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام شافعیؒ اجماع سے استدلال کرتے ہیں اور اسے احکام و قوانین کا مصدر مانتے ہیں۔ لیکن اجماع کو امام مالکؒ کی طرح مقید و مشروط کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اجماع معتبر ہے جو عہد رسالت کے بعد ایک عصر کے تمام فقہاء اور مجتہدین کا کسی حکم شرعی کے بارے میں ہو اور اس کے ساتھ مزید یہ قید لگاتے ہیں کہ فقہائے عصر میں سے کسی کے اختلاف کا ہمیں علم نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی حکم پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہو تو وہ ان کے نزدیک اجماع نہیں کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کسی ایک علاقے کے فقہاء اور مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر اتفاق ہو تو وہ بھی امام شافعیؒ کے نزدیک اجماع کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

اجماع کے بارے میں امام شافعیؒ کے اس نظریئے سے یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے اجتہادی مسائل میں اجماع کے اصول کو تسلیم کیا مگر اس کی جو تعریف کی، اس کے لیے جو شرائط مقرر کیں اور جو پیمانہ وضع کیا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کسی زمانے میں اس قسم کا اجماع منعقد ہو سکتا ہے۔ صحابہؓ کے اجماع کو وہ خبر واحد پر ترجیح دیتے ہیں۔

اجماع کے دائرے کو امام شافعیؒ نے ایک اور طریقے سے تنگ کیا وہ اس طرح کہ انہوں نے اجماع کی ایک قسم اور صورت کو جسے فقہاء نے اجماعِ سکوتی سے تعبیر کیا، رد کر دیا۔ اجماع سکوتی یہ ہے کہ مجتہدین میں سے کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کی مدد

۱۴۔ حوالہ بالا ص ۳۷۵

۱۵۔ توالی التاسیس ص ۵۳ وما بعد

سے کسی ایک نتیجہ پر پہنچے اور کوئی ایک رائے قائم کرے، وہ رائے اس کے اپنے دور میں معروف ہو، دوسرے فقہاء اور مجتہدین اس سے آگاہ ہوں لیکن اس کی مخالفت نہ کریں۔ امام ابو حنیفہؒ اجماع کی اس قسم کو بھی حجت مانتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ شرعی احکام کے مصادر میں سے ایک مصدر ہے(۱۶)۔

اجماع کے بارے میں امام شافعیؒ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ مناظرے کے وقت اگر اجماع سے ان کے خلاف کوئی دلیل پیش کی جائے تو ان مسائل میں وہ اجماع کا انکار کرتے ہیں۔ مناظرہ کرنے والا جب ان سے پوچھتا ہے کہ یہ بتایئے کہ اجماع کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں؟ تو پھر وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ بے شک فرائض کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص ناواقفیت کا انکار نہیں کرسکتا۔ پس یہ ایسا اجماع ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ تمام لوگوں نے ان مسائل پر اتفاق کر لیا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں یہ اجماع نہیں ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی طریقہ جس سے اجماع کی صداقت پرکھی جاسکتی ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "اختلاف الحدیث" میں وضاحت کی ہے کہ صحابہ اور تابعین نے جن امور پر اجماع کیا تھا وہ اصول فرائض اور واجبات سے تعلق رکھتے ہیں۔

امام شافعیؒ صحابہؓ کے اجماع کو خبر واحد کے مقابلے میں حجت مانتے اور اسے ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا اجماع، خبر واحد سے بالا تر ہے۔ البتہ اجماع صحابہؓ نہ ہونے کی صورت میں خبرِ واحد پر عمل کیا جائے گا، بشرطیکہ صحیح سند سے ثابت ہو۔

۴۔ قیاس کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر

کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے بھی جب کسی مسئلے میں کوئی رہ نمائی نہیں ملتی تو پھر امام شافعیؒ قیاس سے کام لیتے ہیں۔

امام شافعیؒ سے پہلے فقہاء نے ایسے مسائل اور حوادث کا حکم معلوم کرنے کے لیے قیاس سے کام لیا ہے جہاں کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع نے کسی حکم کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن امام شافعیؒ سے پہلے بنیادی اور اصولی ضابطوں کے علاوہ دوسرے ذیلی اور تفصیلی قواعد وضوابط نہ تھے۔ انہوں نے وہ وضع کیے، قیاس کے حدود کا تعین کیا اور بتایا کہ قیاس کا عمل کس حد تک جائز ہوگا اور کس حد کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کے مراتب کا تعین کیا اور یہ بھی بتایا کہ کیا ہر فقیہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے قیاس کرسکتا ہے یا اس کی کچھ شرائط اور قیود ہیں۔

شرعی مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع، خواہ وہ اجماع صحابہؓ ہو یا اجماع فقہاء، ایک محفوظ اور بے خطر طریق کار تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں قیاس ایک نازک اور پُر خطر طریق کار تھا۔ امام شافعیؒ

۱۶۔ الرسالہ ص ۶۹

نے اس کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کیا۔ ان کے فکر و نظر نے یہ رسائی کی کہ اس عقلی طریق کار کو اگر بے قید چھوڑا گیا تو آنے والے ادوار میں غیر مخلص لوگ اسے غلط استعمال کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تفصیلی قواعد اور ضوابط مرتب کر کے اس کے تمام درواز ے بند کر دیئے۔ ادلہ شرعیہ کے بارے میں انہوں نے جو قواعد و ضوابط مقرر کیے، بعد میں آنے والے فقہاء نے انہیں تسلیم کیا اور پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرتے وقت انہیں ملحوظ رکھا۔

امام شافعیؒ مصلحتِ مرسلہ کو بھی صرف اس صورت میں تسلیم کرتے ہیں جب وہ اس مصلحت معتبرہ کے مشابہ ہو جو نص سے یا اجماع سے ثابت ہو۔ امام شافعیؒ عملِ اہلِ مدینہ کی حجیت کے بھی قائل نہیں ہیں[۱۷]۔

شافعی مسلک کی ترویج و اشاعت

شافعی مسلک کی ابتداء عراق سے ہوئی، کیوں کہ مدینہ اور امام مالکؒ کو چھوڑنے کے بعد امام شافعیؒ نے عراق میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس وقت بلادِ اسلامیہ کی صورت حال یہ تھی کہ لوگ کسی ایک امام کی تقلید میں منحصر نہیں ہوئے تھے۔ حجاز اور عراق بطور خاص فقہاء کے مراکز تھے۔ لوگوں کی جس فقیہ اور مجتہد تک رسائی ہوتی یا جو جس سے قریب ہوتا، بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس کا جس پر دل مطمئن ہوتا وہ اس سے مسئلہ پوچھ لیتا اور فتویٰ لے لیتا۔ کسی خاص امام کی پیروی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور لوگ فقہی مسالک کو دین کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے فقہی مسلک کی بنیاد عراق میں پڑی، یہیں اس کی ابتدائی نشوونما ہوئی اور یہیں سے اس کے تعارف کا آغاز ہوا۔ زندگی کے آخری پانچ سال آپ نے مصر میں گذارے[۱۸]۔

عراق میں علم فقہ امام ابو حنیفہؒ کے ذریعہ صرف یہ کہ متعارف ہو چکا تھا بلکہ اپنے قدم جما چکا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے نامور تلامذہ نے بھی عراق ہی کو اپنی علمی کاوشوں کا مرکز بنایا اس لیے کوئی دوسرا فقہی مسلک وہاں زیادہ پھل پھول نہ سکا۔ پھر بھی امام شافعیؒ جب عراق کو خیر باد کہہ کر مصر گئے تو آپ نے اپنے پیچھے عراق میں امام احمد بن حنبلؒ، امام داؤد ظاہریؒ، امام ابو ثور بغدادیؒ اور امام ابن جریر طبریؒ جیسے باصلاحیت تلامذہ چھوڑ ے۔ ان حضرات نے عراق میں فقہ شافعی کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر چہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن جریر طبریؒ نے بعد میں اپنے الگ فقہی مسلک کی بنیاد ڈالی[۱۹]۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ عراق اور مصر کے علاوہ خراسان اور ماوراء النہر میں بھی شافعی مسلک پھیل گیا۔ فتاویٰ اور درس و تدریس میں شوافع نے احناف کی ہم سری اور برابری اختیار کر لی۔ دونوں مسالک کے علماء میں مناظروں اور علمی مباحث کی مجالس

۱۷۔ مناہج الاجتہاد ص ۲۶۶

۱۸۔ الانتقاء ص ۶۸

۱۹۔ الامام الشافعی ص ۳۷۱

خوب گرم ہونے لگیں اور ہر ایک مسلک کے علماء نے اختلافی مسائل پر اپنے دلائل سے کتابوں کو بھر ڈالا۔ لیکن مشرق پر تباہی اور بربادی کی آندھی چلی تو وہاں کی ساری علمی رونقیں قصۂ پارینہ بن گئیں۔ اس انقلاب نے وہاں سے شافعی مسلک کو بالکل ختم کر دیا۔

مصر میں شافعی مسلک کو تیسری صدی ہجری ہی سے فروغ حاصل ہوا لیکن جب وہاں دولتِ فاطمیہ قائم ہوئی تو حکومتی سطح پر اہلِ سنت کے فقہی مسالک کو ختم کر دیا گیا۔ اس وقت وہاں فقہ مالک اور فقہِ شافعی زیادہ مقبول تھا، فقہِ حنفی کے علماء بھی موجود تھے اور وہ بھی اہلِ مصر کے لیے غیر معروف نہ تھا۔ دولتِ فاطمیہ میں فقہِ اہلِ تشیع کو رائج کیا گیا۔ حتیٰ کہ صلاح الدین یوسف بن ایوب کے ہاتھوں دولتِ فاطمیہ کا خاتمہ ہوا۔ اس وقت شافعی مسلک پہلے سے زیادہ توانائی کے ساتھ ابھرا۔ امام ابو حامد محمد غزالی (م ۵۰۵ھ) علامہ تقی الدین بن دقیق العیدؒ (م ۷۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) جیسے اہلِ علم و فضل نے مصر میں شافعی مسلک کو قوت بخشی۔

دولتِ ایوبیین کے پورے عرصے میں عدالتی نظام شافعی مسلک کے مطابق رہا۔ مصر میں شافعی مسلک آج تک مالکی مسلک کے شانہ بشانہ ہے۔ بالائی مصر میں مالکی مسلک کا غلبہ ہے اور زیریں مصر میں شافعی مسلک کا[۲۰]۔

شام میں ابتداءً (تیسری صدی ہجری میں) امام اوزاعیؒ کا فقہی مسلک پھیلا، لیکن اس کا اثر و نفوذ بہت کم عرصہ قائم ہوا۔ دمشق کے مفتی ابو الحسن احمد بن سلیمانؒ کی وفات کے ساتھ ہی شام میں اوزاعی مسلک ختم ہو گیا۔ یہ ۳۴۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ یہ اوزاعی مسلک کے شام میں آخری مفتی اور فقیہ ثابت ہوئے۔ اوزاعی مسلک کی جگہ شام میں شافعی مسلک نے لے لی۔ اس طرح مصر میں شافعی مسلک، مالکی مسلک کے شانہ بشانہ قائم ہو گیا۔ شام میں اس نے حنفی مسلک کے بعد اپنے لیے جگہ بنا لی۔ شام میں علامہ محی الدین نوویؒ اور علامہ عز الدین بن عبد السلامؒ نے نہ صرف اپنی قابلیت و شہرت کا سکہ جمایا بلکہ شافعی مسلک کی بھی قابلِ قدر خدمت کی۔

حجاز، شام، عراق اور مصر کے علاوہ شافعی مسلک کا اثر و رسوخ یمن میں بھی ہوا، فارس میں بھی اس کا تعارف ہوا اور اس نے وہاں اپنے پیروکاروں کا ایک حلقہ بنایا لیکن جب حکومت اہلِ تشیع کے ہاتھوں میں آگئی تو وہاں سے اہلِ سنت کے تمام فقہی مسالک ختم ہو گئے اور صرف دو فقہی مسلک باقی رہ گئے، فقہِ اہلِ تشیع اور فقہ حنفی۔ آج تک ایران میں یہی صورت حال ہے۔

بلادِ مغرب اور اندلس میں شافعی مسلک کبھی داخل نہ ہو سکا۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس علاقے میں کوئی بھی فقہی مسلک، فقہِ مالک کی برتری کو ختم نہیں کر سکا۔ علامہ مقدسیؒ کے بقول مالکی علماء کو امام شافعیؒ پر یہ غصہ تھا کہ انہوں نے حدیث اور فقہ دونوں امام مالکؒ سے حاصل کیے، جب خود کچھ ہو گئے تو امام مالکؒ سے اختلاف کیا اور اپنا الگ مسلک قائم کر لیا[۲۱]۔

جنوبی ایشیا میں فقہِ شافعی کا اثر و رسوخ صرف ملایا میں ہو سکا۔ ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں بھی شافعی مسلک کے پیروکاروں کی بہت معمولی تعداد ہے۔

۲۰۔ الامام الشافعی ص ۳۷۷

۲۱۔ حوالہ بالا ص ۳۷۳، نیز دیکھیے مقدمہ ابن خلدون باب ۲، فصل ۷

فقہ حنبلی

فقہ حنبلی کے بانی امام احمد بن حنبلؒ

اہل سنت کے فقہی مسالک میں چوتھا مسلک حنبلی مسلک ہے۔ اس کے بانی امام ابو عبد اللہ احمد بن حنبلؒ ہیں۔ آپ ۱۶۴ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۴۱ھ میں وفات پائی (۲۲)۔ دینی گھرانوں کے رواج کے مطابق آپ نے پہلے قرآن کریم کو حفظ کیا، پھر دوسرے علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے جب تعلیم و تربیت کا آغاز کیا، اس وقت بغداد علوم وفنون کا مرکز تھا۔ وہاں محدث، مفسر، فقیہ اور صوفی غرضیکہ ہر رنگ اور ہر وضع کے لوگ موجود تھے۔ ہر ایک کا حلقہ اپنے تنوع اور اختلاف مسلک کے باوجود آباد اور بارونق تھا۔

تعلیم و تربیت

حفظ قرآن کے بعد آپ نے علم لغت اور تحریر و کتابت کی طرف توجہ دی۔ پندرہ برس کی عمر میں آپ نے اپنے آبائی شہر بغداد میں حصول علم حدیث کی ابتداء کی۔ سات برس تک وہ بغداد میں رہ کر ہی وہاں کے محدثین سے اکتساب فیض کرتے رہے اور ۱۸۶ھ تک کوئی بیرونی سفر اختیار نہیں کیا۔ حدیث کے علاوہ مختلف فقہی مسائل کے سلسلے میں صحابہؓ اور تابعین کے فتاویٰ اور فیصلے یاد کرتے تھے۔

۱۸۶ ہجری سے طلب حدیث کے سلسلے میں دوسرے شہروں اور علاقوں کے سفر کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے بصرہ گئے، پھر حجاز کا سفر کیا، یمن گئے، علم کی طلب میں کوفہ بھی گئے۔ ۱۸۷ھ ہجری میں امام شافعی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ امام احمد بن حنبلؒ کو ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ میں امام مالکؒ، امام سفیان بن عیینہؒ اور امام حماد بن زیدؒ سے کسب فیض نہ کر سکا۔

امام احمد بن حنبلؒ بہت زیادہ متبع سنت تھے۔ وہ یہ تجزیہ نہیں کرتے تھے کہ کون سی سنت، سنن ہدیٰ (۲۳) سے ہے اور کون سی سنن عادات (۲۴) سے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ہر وہ کام کریں جس کا ثبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس

۲۲۔ تذکرۃ الحفاظ ۲/۱۷

۲۳۔ سنن ہدیٰ: یہ سنن مؤکدہ ہیں جو واجب سے قریب تر ہیں۔ یہ شعائر دین میں سے ہیں مثلاً جماعت، اذان اور فرض نماز کے ساتھ پڑھی جانے والی سنن مؤکدہ وغیرہ۔ جن کو ذکر کرنے والا اجر و ثواب کا مستحق اور نہ کرنے والا آخرت میں شفاعت سے محروم ہوگا۔

۲۴۔ سنن عادات: وہ سنن جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات میں شامل ہوں اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھار ہی چھوڑا ہو۔ انہیں سنن زوائد بھی کہتے ہیں مثلاً چلنا، سواری کرنا، کھانے، پینے، سونے اور جاگنے وغیرہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اطوار و عادات مبارکہ۔ ان سنتوں کے کرنے پر ثواب ملتا ہے لیکن ان کے تارک پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

سے انہیں مل جائے اور ہر ایسے کام سے گریز کرتے تھے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ پختہ عقیدے کے مالک تھے۔ آپ نے بھی اظہارِ حق کی خاطر اپنے دو پیش رو (امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ) کی طرح بہت سختیاں جھیلیں۔ جب خلیفہ واثق باللہ نے آپ کو مجبور کرنا چاہا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کریں تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی پاداش میں قید و ضرب کی مصیبتیں اٹھائیں، مگر جو بات حق تھی اور صحابہ کرامؓ سے جو عقیدہ چلا آ رہا تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے، اسی پر قائم رہے[۲۵]۔

امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں بغداد سے مصر روانہ ہوتے وقت جو مختصر جملہ کہا، ایک استاد کی طرف سے اپنے شاگرد کے لیے اس سے بڑھ کر خراجِ تحسین نہیں ہو سکتا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: میں بغداد سے اس حال میں کوچ کر رہا ہوں کہ اپنے پیچھے احمد بن حنبلؒ سے بڑھ کر کوئی فقیہ اور متقی چھوڑ کر نہیں جا رہا[۲۶]۔

آپ اجتہاد بالرائے سے احتراز کرتے اور امکانی حد تک قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کرتے تھے۔ ظاہر حدیث پر عمل کو ترجیح دیتے تھے اور اس بات میں اس حد تک مشہور تھے کہ آپ کو امام مجتہد سے زیادہ محدث مانا گیا ہے۔ علامہ ابن الندیمؒ (م ۴۳۸ھ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الفھرست" میں انہیں امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام مسلم بن حجاج قشیریؒ (م ۲۶۱ھ) اور دیگر محدثین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البرؒ (م ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب "الانتقاء فی فضائل الائمة الفقهاء" میں، امام طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے اپنی کتاب "اختلاف الفقهاء" میں اور علامہ ابن قتیبہؒ (م ۲۷۵ھ) نے اپنی تالیف "المعارف" میں امام احمد بن حنبلؒ کے فقہی مسلک کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن جمہور علماء نے کسی بھی دور میں ان حضرات کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اپنے آغاز اور نشوونما کے وقت سے لے کر آج تک حنبلی مسلک کا شمار اہل سنت کے چار فقہی مسالک میں ہوتا ہے۔ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں ایک مجتہد کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے مکتبِ فکر کا ایک مستقل اسلوب اور اندازِ فکر ہے۔ بہت سے مسائل میں انہوں نے نہ صرف دو قدیم فقہی مسالک (حنفی، مالکی) سے اختلاف کیا ہے بلکہ اپنے استادِ محترم امام شافعیؒ سے بھی بعض اصول و فروع میں ان کا اختلاف ہے اور وہ منفرد رائے کے حامل ہیں۔ ان کا شمار امام شافعیؒ کے خاص اور ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے[۲۷]۔

تلامذہ

فقہ امام احمد بن حنبلؒ کو قلم بند کرنے، اس کی نقل و جمع اور تدوین و اشاعت میں ان کے جن تلامذہ نے نمایاں حصہ لیا وہ حسب ذیل ہیں:

۲۵۔ وفیات الاعیان ۱/۳۳

۲۶۔ الفقہ الاسلامی ص ۱۵۲

۲۷۔ الفہرست ص ۳۲۱

۱۔ صالح بن احمد بن حنبلؒ (م ۲۶۶ھ)۔ امام احمد بن حنبلؒ کے بڑے بیٹے۔ آپ اپنے والد کے فتاویٰ اور فقہی آراء کے بہت بڑے حافظ و محافظ تھے۔

۲۔ ابو بکر احمد بن محمد بن ھانی الاثرمؒ (م ۲۶۱ھ)۔ یہ امام احمدؒ کے ان تلامذہ میں ہیں جو پختگی کی منزل تک پہنچنے کے بعد ان کے دامنِ فضل و کمال سے وابستہ ہوئے۔ آپ نے امام احمدؒ سے مسائلِ فقہ کے علاوہ بہت سی احادیث بھی روایت کیں۔

۳۔ عبد الملک بن عبد المجید بن مہران میمونیؒ (م ۲۷۴ھ)۔ بیس برس امام احمدؒ کی خدمت میں رہے۔ آپ امام احمدؒ کے ان تلامذہ میں سے ہیں جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے فقہ امام احمدؒ کی نقل و جمع کا اہتمام کیا۔

۴۔ احمد بن محمد بن حجاج ابو بکر مروزیؒ (م ۲۷۵ھ)۔ ان کا شمار امام احمدؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی وفات ہوئی تو انہوں نے ہی ان کو غسل دیا۔ علامہ مروزیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے جو کچھ نقل کیا ہے اس میں فقہی روایات کا ذخیرہ زیادہ ہے، احادیث کا حصہ بہت کم ہے۔

۵۔ ابراہیم بن اسحاق الحربیؒ (م ۲۸۵ھ)۔ فقہ اور حدیث پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کئی قابلِ ذکر کتابوں کے مصنف ہیں۔ بیس برس امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں گزارے۔

۶۔ احمد بن محمد بن ہارون ابو بکر الخلالؒ (م ۳۱۱ھ)۔ فقہ احمد بن حنبلؒ کی نقل و تدوین میں ان کا سب سے زیادہ حصہ ہے ان کو بلاشبہ فقہ حنبلی کا جامع کہا جا سکتا ہے۔ امام احمدؒ کے ہاں درجہ اختصاص رکھتے تھے[۲۸]۔

امام احمد بن حنبلؒ سے براہ راست استفادہ کرنے والے مذکورہ بالا اہلِ علم و فضل کے علاوہ جو اہم اہلِ علم حنبلی مسلک کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنے اور مختلف ادوار میں گراں قدر خدمات انجام دیں، ان میں یہ اسماء بہت نمایاں ہیں:

ابو القاسم عمر بن حسین الخرقیؒ (م ۳۳۴ھ)، عبد العزیز بن جعفر غلام خلالؒ (م ۳۶۳ھ)، موفق الدین ابن قدامہؒ (م ۶۲۰ھ) مصنف کتاب "المغنی" - نہ صرف فقہ امام احمد بن حنبل بلکہ فقہ اسلامی کی مستند اور بلند پایہ کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ شمس الدین قدامہ مقدسیؒ (م ۶۸۲ھ)، مولف کتاب "الشرح الكبير على متن المقنع"۔ تقی الدین ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) مصنف منهاج السنة، معارج الاصول، فتاویٰ، ابن القیم الجوزیہؒ (م ۷۵۱ھ)۔ امام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کے ذریعے آٹھویں صدی ہجری میں فقہ حنبلی کی تجدید ہوئی۔ علامہ ابن القیم الجوزیہؒ کی کتاب "اعلام الموقعین" فقہی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

بارہویں صدی ہجری میں محمد بن عبد الوہابؒ نے حنبلی مسلک کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ حجاز میں آلِ سعود کے اقتدار کے بعد حنبلی مسلک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مملکت عربیہ سعودیہ کا یہی فقہی مسلک ہے۔ حجاز سے باہر مسلم دنیا کے کسی

۲۸۔ تاریخ بغداد ۱۲۴/۴۔ الفہرست ص ۳۲۳

حصے میں یہ مسلک رائج نہ ہو سکا(۲۹)۔

امام احمد بن حنبلؒ، محدث یا مجتہد؟

أئمہ اربعہ میں امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں اہل علم کی دو رائے ہیں کہ آیا وہ صرف محدث تھے یا اس کے ساتھ فقیہ اور مجتہد بھی تھے۔ ان کے اصولِ اجتہاد کے ذکر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مختصر بیان ہو جائے کہ ان کے فقیہ و مجتہد ہونے کا بعض اہل علم نے کیوں انکار کیا؟۔

اس کی سب سے واضح اور بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حدیث میں ان کا اشتغال، ان کے تفقہ پر غالب تھا۔ وہ آثار رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہؓ کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ فقہ کے میدان میں وہ بہت آگے نکل نہ جائیں۔ دوسرے فقہاء نے جن حدوں کو بے تکلف پار کیا، وہاں ان پر تردد اور تامل کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اہل علم نے یہ خیال کیا کہ وہ محدث تھے فقیہ نہ تھے۔ امام ابن جریر طبریؒ نے اپنی کتاب "اختلاف الفقهاء" میں امام احمد بن حنبلؒ کے فقہی مسلک کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ محدث ہیں، فقیہ نہیں ہیں۔ بعض ایسے فقہاء جو اختلافیات کے مسائل میں بحث کرتے ہیں، ان کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً علامہ طحاویؒ، علامہ نسفیؒ، علامہ ابو بکر بن عربیؒ اور امام غزالی نے اختلافی مسائل میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح علامہ ابن قتیبہؒ نے اپنی کتاب "المعارف" میں اور علامہ مقدسیؒ نے اپنی کتاب "احسن التقليم" میں بطور فقیہ و مجتہد امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر نہیں کیا بلکہ انہیں اصحاب حدیث میں شمار کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے اپنی تالیف "الانتقاء" میں فقیہ و مجتہد کے طور پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ رحمہم اللہ کا ذکر کیا ہے، امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ نہیں کیا۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ امامِ فقہ نہ تھے، فقہی مآخذ پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی(۳۰)۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ فقیہ و مجتہد نہ تھے، ان کی دلیل یہ ہے کہ نہ تو فقہ میں ان کی کوئی کتاب ہے اور نہ ان کے مرتبہ مجموعہ احادیث "مسندالامام احمد بن حنبل" میں فقہ کا کوئی اثر ہے جیسا کہ "موطا امام مالکؒ" میں ہے کہ بنیادی طور پر وہ مجموعہ احادیث ہے لیکن اس پر فقہ امام مالکؒ کی گہری چھاپ ہے۔ امام مالکؒ کی فقہی آراء اور ان کے اجتہادات اس میں کثرت سے ملتے ہیں اور تمام اہل علم نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ امام مالکؒ کی "الموطا" بیک وقت حدیث اور فقہ دونوں کی کتاب ہے۔ اس کے برخلاف "مسند الامام احمد بن حنبلؒ"، کلی طور پر یک طرفہ کتاب ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں تدوین فقہ کا کام کافی حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ امام محمد بن حسین شیبانیؒ اور قاضی ابو یوسفؒ فقہ امام ابو حنیفہؒ کو مرتب و

۲۹۔ تاریخ بغداد ۴/۴۲۳

۳۰۔ المدخل الی علم اصول الفقہ ص ۱۱۳

مدون کر چکے تھے۔ فقہ میں ان دونوں حضرات کی مولفات سامنے آ چکی تھیں، امام مالکؒ کی "الموطا" اہل علم میں قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور امام شافعیؒ اپنے اجتہادات اور فقہی آراء کو نہ صرف یہ کہ املاء کرا چکے تھے بلکہ ان کی اہم اور بنیادی کتاب "الرسالۃ" نے بھی تصنیف و تالیف کے مرحلے سے گذر کر اہل علم تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ فقہ کے موضوع پر اتنے گراں قدر اور وسیع کام کے باوجود امام احمد بن حنبلؒ کے ہاں اس حوالہ سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ یہ صورت حال اس موقف اور نظریے کو تقویت پہنچاتی ہے کہ وہ محدث تھے، فقیہ نہ تھے [۳۱] یا کم ازکم یہ کہ ان کی فقہ پر حدیث غالب ہے۔

بات یہ ہے کہ جو محدثین فقہی مسائل میں صاحب الرائے تھے انہیں فقہاء کے بجائے طبقہ محدثین میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ، کیوں کہ اعتبار غلبہ منہاج کا ہوتا ہے۔ جس پر جس فن کا رنگ غالب ہوگا وہ اس کا آدمی شمار کیا جائے گا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو امام مالکؒ کی شخصیت ایسی ہے کہ حدیث اور فقہ دونوں میں انہیں یکساں مقام حاصل ہے۔

اس اعتراف کے باوجود کہ امام احمد بن حنبلؒ پر حدیث کا غلبہ تھا، انھوں نے حدیث میں اپنی عظیم و جلیل کتاب "مسندالامام احمد بن حنبلؒ" یادگار چھوڑی، جب کہ فقہ میں ان کا کوئی اثاثہ مرتب و مدون شکل میں اہل علم تک نہیں پہنچا۔ جمہور علماء اور فقہاء نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ پر اگرچہ حدیث کا رنگ غالب تھا، جس کی چھاپ ان کے اصول اجتہاد پر بھی بہت نمایاں ہے، وہ محدث ہونے کے ساتھ فقیہ اور مجتہد بھی تھے۔ انہوں نے اپنی فقہی آراء اور اجتہادات پر مبنی کوئی کتاب از خود مرتب نہیں کی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقیہ نہ تھے، فقہی مسائل کی جمع و تدوین کا کام انہوں نے اپنے تلامذہ پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے ان کے اقوال، افکار و آراء اور فتاویٰ کو جمع کیا اور اس طرح وہ فقہی مجموعہ تیار ہوا جو ان کی طرف منسوب ہے [۳۲]۔

حافظ ابن قیمؒ نے بھی اس بارے میں گفتگو کی ہے، وہ اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں:

> "امام احمد نے فقہ میں کوئی کتاب اس لیے مرتب و مدون نہیں کی ہے کہ وہ حدیث کے علاوہ کسی اور موضوع پر تصنیف کتب کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، انہوں نے تصنیف و تالیف کے لیے صرف حدیث کو اپنا موضوع بنایا۔ فقہ کے میدان میں انہوں نے جو خدمت کی، اللہ نے اسے قبول فرمایا۔ انہیں ان کی حسن نیت کا ثمر ملا۔ جو کام انہوں نے خود نہیں کیا تھا، اسے ان کے نامور، لائق اور مخلص تلامذہ نے سرانجام دیا" [۳۳]۔

۳۱۔ المدخل الی علم اصول الفقہ ص ۳۴۸

۳۲۔ حوالہ بالا ص ۳۴۸

۳۳۔ اعلام الموقعین ۱/۲۲

حافظ ابن قیمؒ کی اس رائے کو درست ماننے کے لیے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کو حدیث سے اتنا گہرا تعلق اور شغف تھا کہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اہل علم اور بطور خاص ان کے تلامذہ حدیث سے بے نیاز ہو جائیں یا حدیث کی طرف ان کی توجہ کم ہو جائے، بایں ہمہ ان کے شاگردوں نے ان کے فقہی مسائل مرتب کیے اور ان کے فتاویٰ کی بڑی تعداد کتابوں میں نقل کی۔

بعض شافعی علماء نے امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کہا ہے کہ ان کا اپنا کوئی مستقل اور الگ فقہی مسلک نہ تھا بلکہ وہ شافعی مسلک کے پیروکار تھے(۳۴)۔ شافعی علماء کے یہ کہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ایک عرصہ تک بغداد میں ان کی صحبت میں رہے۔ لیکن امام شافعیؒ کے ساتھ رہنے یا ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام احمد بن حنبلؒ ان کے فقہی مسلک کے پیروکار بھی ہوں اور ان کا اپنا کوئی فقہی مسلک نہ ہو۔ بالکل ایسی ہی صورت حال امام شافعیؒ کی بھی ہے۔ وہ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور ایک عرصہ تک انہی کے مسلک کی پیروی کرتے رہے مگر بعد میں اپنے فقہی مسلک کی بنیاد رکھی اور بلا اختلاف مجتہد مستقل کہلائے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں یہ بات تو بہت سے اہل علم نے کہی کہ وہ مجتہد اور فقیہ نہ تھے بلکہ محدث تھے، مگر یہ رائے قول شاذ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ امام احمد بن حنبلؒ امام شافعیؒ کے مقلد ہیں اور ان کا کوئی مستقل فقہی مسلک نہیں ہے۔

فقہ امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے دوسرے اہل علم سے قدرے مختلف ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ وہ زیادہ گہرائی پر مبنی ہے۔ انہوں نے اس کا باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ حنبلی مسلک کو شافعی مسلک ہی میں شامل سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ فقہ شافعی کے مقابلے میں اگر اس کی کوئی حیثیت ہے تو صرف اتنی، جتنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی فقہی آراء اور فتاویٰ کو امام ابو حنیفہؒ کے فقہی مسلک اور ان کی آراء کے مقابلے میں ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ فقہ حنبلی کو فقہ شافعی کے ساتھ ضم کر کے مدون نہیں کیا گیا جیسا کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے فقہی مسلک کا معاملہ ہوا، کہ ان کی فقہی آراء اور فتاویٰ کی تدوین امام ابو حنیفہؒ کے فقہی مسلک میں ضم ہے اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسنؒ کی منفرد آراء بھی فقہ حنفی ہی کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس کے باعث فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کو ایک الگ مسلک شمار کیا گیا''(۳۵)۔

۳۴۔ المدخل الی علم اصول الفقہ ص ۳۴۸

۳۵۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص ۵۵، ۵۶

اصولِ اجتہاد

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے اجتہاد کی بنیاد کن اصول پر رکھی، اس پر سب سے واضح بحث حافظ ابن القیم الجوزیہؒ نے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے اپنے فقہی اجتہاد و استنباط کی بنیاد پانچ اصول پر قائم کی، جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ا۔ نصوص

امام احمد بن حنبلؒ اپنے اصول اجتہاد میں سب سے مقدم جس چیز کو رکھتے ہیں وہ نصوص ہیں، خواہ وہ کتاب اللہ کے ہوں یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ جب کسی بارے میں انہیں کوئی نص مل جاتا ہے تو پھر اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے، اس پر فتویٰ دیتے ہیں۔ نص کو صحابہؓ کے فتاویٰ اور اقوال پر مقدم رکھتے ہیں۔ کتب فقہ حنبلی میں ایسی متعدد مثالیں ذکر کی گئی ہیں جہاں امام احمد بن حنبلؒ نے نص کے مقابلے میں صحابہؓ کے فتاویٰ کو رد کیا ہے۔ مثلاً حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان کو غیر مسلم کی وراثت نہیں ملتی مگر حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت معاویہؓ کا قول ہے کہ مسلمان کو غیر مسلم کی میراث ملنی چاہئیے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے دونوں صحابہؓ کے قول اور فتویٰ کو حدیث کی بنیاد پر رد کر دیا[۳۶]۔

۲۔ فتاوائے صحابہؓ

قرآن اور سنت سے کوئی نص نہ ہونے کی صورت میں فقہ حنبلی کی دوسری اصل صحابہؓ کرام کے فتاویٰ ہیں۔ نص نہ ہونے کی صورت میں جب انہیں صحابہؓ کا کوئی فتویٰ مل جاتا اور اس فتوے کے خلاف کسی دوسرے صحابی کا فتویٰ ان کے علم میں نہ ہوتا تو وہ اسے قبول کرتے اور اسی پر اپنی رائے اور فتوے کی بنیاد رکھتے تھے۔ لیکن وہ ایسے فتوے کو اجماع سے تعبیر نہیں کرتے تھے بلکہ وہ کہتے کہ مجھے اس کے خلاف کوئی قول اور رائے نہیں ملی۔ اجماع سے تعبیر نہ کرنا امام احمدؒ کے انتہائی محتاط رویہ کی بنا پر تھا۔ مثلاً انہیں حضرت انس بن مالکؓ کے اس قول کا علم ہوا کہ غلام کی گواہی قابل قبول ہے۔ انہوں نے اسی قول پر اپنے فتوے کی بنیاد رکھی اور یہ کہا کہ مجھے کسی صحابی کا ایسا کوئی قول اور فتویٰ نہیں ملا جو قولِ انسؓ کے خلاف ہو[۳۷]۔

انہیں کسی ایک صحابی کا بھی کوئی قول، فتویٰ یا عمل مل جاتا تو پھر اس کے خلاف نہ رائے قائم کرتے، نہ فتویٰ دیتے اور نہ عمل کرتے بلکہ اپنی رائے، قول اور عمل سب کی بنیاد قولِ صحابی پر رکھتے[۳۸]۔

۳۶۔ اعلام الموقعین ۱/۲۳۔ تاریخ بغداد ۴/۴۲۱

۳۷۔ حوالہ جات بالا

۳۸۔ مناہج الاجتہاد ص ۶۸۳

۳۔ اقوالِ صحابہؓ میں ترجیح کا معیار

امام احمدؒ کا تیسرا اصول یہ تھا کہ اگر کسی مسئلے میں صحابہؓ کی مختلف آراء ہوتیں تو پھر اس رائے کو قبول کرتے اور ترجیح دیتے تھے جو قرآن و سنت سے قریب تر ہو۔ لیکن صحابہؓ کی آراء اور فتاوی کو چھوڑ کر کوئی منفرد رائے اختیار نہیں کرتے تھے اور نہ ہی قیاس سے کام لیتے تھے۔ اگر ان اقوال و فتاوی میں سے کسی کا قرآن اور سنت سے اقرب ہونا ثابت نہ ہوتا تو پھر تمام اقوال کو ذکر کرتے اور کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔

حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ اس بات کو مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول اور فتوے کو مرجوح قرار دیں(۳۹)۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ جب اقوال صحابہؓ میں اختلاف پاتے تو پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ ان میں سے کوئی قول خلفائے راشدینؓ میں سے کسی کا ہے یا نہیں؟ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ فلاں قول فلاں خلیفہ راشدؓ کا ہے تو اسے ترجیح دیتے۔ خلفائے راشدینؓ کے اقوال اور فتاوی کو ترجیح دینے کی بہت مضبوط وجوہ ہیں، خود ان کا خلیفہ راشد ہونا، عشرہ مبشرہ میں سے ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کہ ''میرے بعد میرے خلفاء کی پیروی کرنا جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ خلفائے راشدینؓ میں بطور خاص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بعض فیصلے اور فتاویٰ ایسے ہیں جن پر صحابہ کا اجماع منعقد ہوا۔

اقوالِ صحابہؓ کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ان کی یہ آخری رائے اور نظریہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک سے قریب تر ہے، جیسا کہ فقہ امام ابوحنیفہؒ کی بحث میں بیان کیا گیا(۴۰)۔

۴۔ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف سے استنباط

فقہ امام احمدؒ کی چوتھی اصل یہ ہے کہ وہ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف کو اس صورت میں قبول کر لیتے تھے جب کہ مسئلہ زیر بحث میں کوئی دلیل اس کے خلاف نہ ہو۔ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف مل جانے کی صورت میں وہ قیاس کو اختیار نہیں کرتے تھے۔ یہاں حدیث ضعیف سے مراد باطل اور منکر حدیث نہیں ہے، جس کی سند میں کوئی متہم راوی ہو اور جو قابل حجت نہ ہو سکتا ہو۔

دوسرے آئمہ مجتہدین کا بھی اس اصل کے بارے میں یہی نظریہ ہے۔ حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم رکھتے ہیں۔ امام

۳۹۔ اعلام الموقعین ۲۴/۱

۴۰۔ المدخل الی مذہب الامام احمد بن حنبل

ابو حنیفہؒ نے نماز میں قہقہہ والی حدیث کو قیاس پر ترجیح دی ہے حالانکہ تمام محدثین نے اس حدیث کوضعیف کہا ہے(۴۱)۔

امام احمد بن حنبلؒ کا ایک یہ قول بھی بعض اہل علم نے نقل کیا ہے کہ وہ اگر کسی مسئلے میں نہ قرآن اور سنت کی کوئی نص پاتے، نہ کوئی حدیث ضعیف اور حدیث مرسل ملتی، نہ کسی صحابی کے قول، عمل یا فتوے تک ان کی رسائی ہوتی تو پھر وہ کسی ایسے تابعی کا قول یا فتوی تلاش کرتے جو طبقہ تابعین میں اپنے تدین اور علم وفضل کے باعث ممتاز اور نمایاں مقام کا حامل ہو۔ کسی ایسے تابعی کا قول یا فتوی مل جاتا تو رائے اور قیاس سے گریز کرتے اور اسے اختیار کر لیتے(۴۲)۔

۵۔ قیاس

امام احمد بن حنبلؒ کے اصول اجتہاد میں پانچویں اصل قیاس ہے۔ انہیں اگر کسی مسئلے میں نہ کتاب اللہ میں کوئی نص ملتی اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، نہ کسی صحابی کا کوئی قول، رائے یا فتویٰ دستیاب ہوتا اور نہ ہی کوئی مرسل یا ضعیف حدیث ہاتھ آتی تو پھر آخری مرحلے میں وہ قیاس سے کام لیتے۔ گویا امام احمد بن حنبلؒ کے ہاں قیاس کا استعمال ضرورت بلکہ مجبوری کی صورت میں تھا(۴۳)۔

۶۔ اجماع

فقہ امام احمد بن حنبلؒ کے اصول اجتہاد کی بحث میں یہ بات بہت اہم ہے کہ حافظ ابن قیمؒ نے جو کہ فقہ حنبلی کے نمایاں ترجمان ہیں، اجماع کو امام احمد بن حنبلؒ کے اصول اجتہاد میں شمار نہیں کیا۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ الکتاب اور السنۃ کے علاوہ اجماع اور قیاس کو بھی جمہور فقہاء نے متفق علیہا مصادر میں شمار کیا ہے۔ اس بناء پر یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر تفصیلات سے دامن بچاتے ہوئے صرف امام احمد بن حنبلؒ کے حوالے سے اس کے بارے میں وضاحت کی جائے کہ کیا واقعی وہ

۴۱۔ حدیث قہقہہ کوعبدالرزاق نے اپنی مصنف (نمبر: ۳۷۶۱) میں درج کیا ہے۔ ایک نابینا شخص کنویں میں گر گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے۔ اس واقعہ پر نماز میں شریک بعض صحابہ ہنس پڑے۔ نبی علیہ السلام نے اختتام نماز کے بعد حکم دیا کہ جو لوگ نماز میں ہنسے ہیں وہ اپنی نماز لوٹائیں اور وضو بھی دوبارہ کریں۔ اس روایت کے رجال اگرچہ ثقہ ہیں مگر مرسل ہے۔ ان کے باوجود امام ابو حنیفہ نے اس حدیث کی موجودگی میں قیاس کو ترک کیا اور اس حدیث کو معمول بہ اور اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیا۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نصب الرایۃ لأحادیث الھدایۃ ۱/۵۱

۴۲۔ مرسل کے معنی یہ ہیں کہ راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا عمل تو بیان کر دیتا ہے مگر سلسلہ روایت کو تابعی پر لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اس صحابی کا نام ذکر نہیں کرتا جس سے اس تابعی نے روایت اخذ کی اور پھر اس صحابی نے براہ راست نبی علیہ السلام سے وہ بات سنی یا ان کا عمل دیکھا اور اس کو نقل کیا۔

۴۳۔ اعلام الموقعین ۱/۳۱۔

کلی طور پر اجماع کے وجود کے منکر ہیں یا جزوی طور پر انہیں اس کے وجود یا حجیت سے انکار ہے۔

اجماع کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا موقف

اجماع کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کے استاد امام شافعیؒ کا جو موقف ہے اور انہوں نے جو روش اختیار کی، کم و بیش اسی راستے پر امام احمد بن حنبلؒ بھی گامزن نظر آتے ہیں۔ ان کے طریق کار اور نقطہ نظر کو اگر مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک اجماع ثبت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ وہ اس کے بل بوتے پر نصوص صریحہ کو چھوڑ دے گا تو اس کا یہ دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ جن مسائل کا کوئی اختلافی پہلو سامنے نہ ہو، ان کے بارے میں (اجماع کا دعویٰ کرنے کے بجائے) یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس مسلک کے خلاف کوئی بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی صاحب علم کے سامنے ایسے مسائل سے سابقہ پڑے جو قرون اولیٰ سے لے کر اس کے زمانے تک مسلمہ چلے آ رہے ہیں اور کوئی اختلافی قول منقول نہیں لیکن اس کے مخالف کوئی حدیث بھی موجود نہیں تو ایسی حالت میں وہی قابل قبول ہے، سب کے خلاف کوئی انوکھا فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ مگر اس کے مخالف کوئی حدیث مل جانے کی صورت میں اس کو فوراً ترک کر دینا ضروری ہے۔

اب اس معاملہ میں دو امور کا اور ذکر کیا جائے گا:

۱۔ یہ کہ امام احمدؒ تمام علمی مسائل میں موجود اجماع کی مطلق نفی نہیں کرتے بلکہ ان دعاوی کی نفی کرتے ہیں جو ہم عصر علماء ایک دوسرے کے خلاف کرتے ہیں جب مناظر اجماع کا نام لے کر حدیث صحیح کو رد کر دینا چاہتا ہو۔

۲۔ امام احمدؒ یہ بات مانتے تھے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں کسی اختلاف کا علم نہیں اور یہ کہ ایسے مسائل قبول کر لیے جائیں گے، اگر کوئی حدیث ان کے بجائے نہ پائی جائے۔ لیکن ان کے بارے میں اجماع کامل کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی مخالف قول کا علم نہیں ہے۔ یہ بات تقاضائے ورع وتقویٰ کے علاوہ حق اور امر واقعی بھی ہے۔

جب یہ بات ہے کہ امام احمدؒ اجماع کے وجود کے سرے سے مخالف نہیں تھے اور مسائل جزئیہ میں دعوائے اجماع کی اس وقت نفی کرتے تھے جب وہ دلیل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا تھا، لہٰذا یہ انکار عقلی طور پر اس کے وجود سے انکار نہیں تھا، جیسا کہ نظام معتزلی اور بعض اہل تشیع کا خیال ہے۔ امام احمدؒ کو اجماع کے وجود سے انکار نہ تھا، البتہ اس کے علم سے انکار تھا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ امام احمدؒ صرف صحابہؓ کے اجماع کے قائل ہیں، اس لیے کہ اس اجماع کی نقل کثرت سے ہوئی اور اس کے علم کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور ثابت بھی ہیں اور صحابہؓ کے بعد جو دو اجماع کے منکر ہیں، اس کا سبب، اسباب علم کی کمی اور قلت ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ دور آیا کہ علماء مختلف شہروں میں پھیل گئے، آپس میں ملاقات دشوار ہو گئی، ان کی تعداد کا شمار کرنا مشکل ہو گیا اور ان کی شناخت اور معرفت کامل آسان نہ رہی۔

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک کثرت آراء سے انعقاد اجماع ہو جاتا ہے کیونکہ امام احمدؒ کسی اجماعی قول

کے بارے میں صرف یہی کہتے ہیں کہ "اس کے مخالف کسی قول کا مجھے علم نہیں"۔
اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب مخالفت قول کا علم نہیں تو اس قول کی موافقت کرنے اور اسے ماننے والوں کی کثرت ہوئی۔ اس پر اتفاق ہے کہ وہ ایسے قول کو جس کا مخالف کوئی دوسرا قول نہ ہو، قبول کر لیتے تھے۔
جب کثرت آراء کو اجماع مان لیا جائے تو پھر امام احمدؒ کے نزدیک وہ حجت ہے اور حدیث صحیح کے بعد اور قیاس سے قبل اس کا مرتبہ ہے، اس لیے کہ قیاس مرتبہ کے اعتبار سے کم رتبہ اور ضعیف ترین چیز ہے۔ امام احمد قیاس سے صرف اس وقت کام لیتے ہیں جب شدید ضرورت لاحق ہو[۴۴]۔

اجماع کے دو درجے

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجماع کے بارے میں امام احمدؒ کی رائے دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:

۱۔ اجماع صحابہ بلکہ اجماع عام، اصول فرائض کے بارے میں اور اجماع صحابہؓ ان مسائل کے بارے میں جو ان کے سامنے پیش آئے اور انہوں نے ان کے سلسلہ میں باہمی تبادلہ خیال کیا اور کسی ایک خاص رائے پر پہنچ گئے۔ یہ اجماع حجت قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ اس کی "سند" (بنیاد) کتاب اللہ و سنت صحیح ہے اور کوئی حدیث صحیح اس کی مخالف نہیں ہے۔ علاوہ ازیں صحابہؓ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات کا راوی اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو گیا ہو اور اس کے مخالف کوئی حدیث موجود ہو لیکن ان کو اس کا علم نہ ہو، نہ ان میں اس کا ذکر آیا ہو اور نہ اس فہم و تخریج میں تبادلہ رائے کیا گیا ہو۔ جب ایسی صورت ہو تو ان کا دور ختم ہونے کے بعد ان کے اجماع کے خلاف کوئی حدیث سامنے آتی ہے تو اسے شاذ سمجھا جائے گا جس کا معارض موجود ہے یعنی اجماع صحابہؓ۔ امام احمد کا مسلک یہ تھا کہ وہ ایسی حدیث ترک کر دیتے تھے جس کا معارض کوئی قوی ہو۔

۲۔ اجماع کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی رائے عام طور پر مشہور ہو گئی ہو اور اس کی مخالفت میں کوئی قول موجود نہ ہو۔ یہ مرتبہ میں حدیث صحیح سے کم ہے اور قیاس سے بالا۔ اجماع کی یہ قسم عہد صحابہؓ کے بعد والے طبقہ (تابعین) میں ہو سکتی ہے۔

اوپر ذکر چکا ہے کہ امام احمدؒ اسی اجماع کو اجماع حقیقی جانتے ہیں جو صحابہ کا ایسے مسائل میں ہو جن پر انہوں نے تبادلہ فکر و نظر کر لیا ہو، جس میں احکام قرآنیہ اور نبویہ کو پیش نظر رکھ کر ایک رائے کو منتخب کر لیا اور اسے معمول بہ بنا لیا ہو، جیسا کہ امام شافعیؒ نے اپنے مناظرات میں اشارہ کیا ہے۔ یہ وقیف نگاہ علماء اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں۔

علامہ شوکانیؒ نے علامہ ابو مسلم الاصفہانیؒ سے ذکر کیا ہے کہ اجماع صحابہؓ کے معتبر ہونے پر علماء متفق ہیں، البتہ غیر صحابہ کے اجماع میں اختلاف ہے۔ علامہ ابو مسلمؒ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ غیر صحابہ کا اجماع غیر ممکن العلم ہے یعنی صحیح طور پر اس کا علم ہونا ناممکن ہے[۴۵]۔

۴۴۔ المدخل إلى مذهب الامام احمد بن حنبل ص ۱۲۹

۴۵۔ ارشاد الفحول ص ۷۹

استصحاب اور مصالح مرسلہ کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا موقف

حافظ ابن قیمؒ نے پانچ فقہی مصادر کا ذکر کیا ہے جن پر امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے فقہ و اجتہاد کی بنیاد رکھی۔ ان کے علاوہ جو مصادر فقہ ہیں ان کے بارے میں انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ امام احمد بن حنبلؒ نے انہیں کلی طور پر مسترد کر دیا ہے یا جزوی طور پر ان سے استفادہ کیا۔ بعض دوسرے اہل علم نے وضاحت کی کہ حافظ ابن قیمؒ کے ذکر کردہ پانچ اصول اور مصادر کے علاوہ دوسرے مصادر شرعیہ کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا موقف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے استنباطِ احکام میں استصحاب سے کافی حد تک کام لیا ہے۔ استصحاب کے معنی یہ ہیں کہ جو بات پہلے سے ثابت ہو وہ اب بھی ثابت رہے بشرطیکہ اسے تبدیل کرنے والا کوئی حکم موجود نہ ہو۔ استصحاب کے اصول اور مصدر ہونے پر چاروں اماموں کا اتفاق ہے، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اسے کس حد تک استعمال کیا جائے؟ حنفی فقہاء نے اس اصول پر بہت کم عمل کیا ہے۔ شافعی اور حنبلی فقہاء نے اس کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جن فقہاء نے نص موجود نہ ہونے کی صورت میں قیاس، استحسان، مصلحت مرسلہ، اور عرف کو استعمال کیا ہے، انہیں استصحاب کی بہت کم ضرورت پیش آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احناف کی طرح مالکی فقہاء نے بھی اس اصول سے زیادہ مدد نہیں لی[۴۶]۔

حافظ ابن قیمؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے اصول اجتہاد میں جس طرح استصحاب کا ذکر نہیں کیا اسی طرح مصالح مرسلہ کا بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ان کے ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے ہاں مصالح مرسلہ کا اعتبار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حنبلی فقہاء مصالح مرسلہ کو بھی اصولِ استنباط میں سے مانتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ کوئی امر ایسا نہیں ہے جسے شارع نے مشروع کیا ہو اور وہ مصالح عباد سے خالی ہو[۴۷]۔

امام احمد بن حنبلؒ کے اصولِ اجتہاد میں ذکر نہ کرنے کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود امام احمد بن حنبلؒ نے مصلحتِ مرسلہ کو حلِ مسائل کے سلسلے میں مصدر کے طور پر استعمال نہیں کیا، یا یہ وجہ ہے کہ وہ مصالح مرسلہ کو قیاس صحیح کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ وہ قیاس کو بھی شدید ضرورت کے وقت کام میں لاتے ہیں۔ ان کی امکانی کوشش ہوتی ہے کہ الکتاب، السنہ اور قولِ صحابی تک اپنے آپ کو محدود رکھیں۔

ذرائع کا اعتبار

ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اگر لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتی ہے تو حصول مقصد کا ہر ذریعہ اور وسیلہ مطلوب مانا جائے گا۔ اگر شریعت کسی امر سے لوگوں کو منع کرتی ہے تو ہر اس ذریعے کو حرام کہا جائے گا جو ممنوع چیز کے وقوع میں مد و معاون

۴۶۔ ارشاد الفحول ص ۶۹

۴۷۔ اعلام الموقعین ۳/۳

ہو، مثلاً نماز جمعہ کا حکم دیا تو اس مقصد کے حصول کے لیے سعی کا بھی حکم دیا اور خرید و فروخت چھوڑ دینے کا حکم دیا، کیوں کہ یہ دونوں نماز جمعہ تک پہنچنے اور اس کو ادا کرنے کے ذریعے ہیں۔

اس اصول کی روشنی میں اگر کوئی امر شریعت میں مطلوب ہے تو دوسرے درجے میں اس کے حصول کا ذریعہ بھی مطلوب ہوگا اور ہر ممنوع اور ناجائز چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ناجائز ہوگا[۴۸]۔

امام احمد بن حنبلؒ ذرائع کو بھی فقہی اصول میں شمار کرتے ہیں۔

ذرائع کے معاملہ میں اکثر فقہاء امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے ہم نوا ہیں اور فقہاء کی ایک قلیل جماعت امام شافعیؒ سے ہم آہنگ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اس معاملہ میں قلتِ اخذ کے اعتبار سے امام شافعیؒ سے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے۔ تاہم قلت و کثرت سے قطع نظر نفس ''سدِ ذرائع'' کے مسئلے میں سب آئمہ کا اتفاق ہے، اختلاف جو کچھ ہے وہ نوعیت میں ہے۔ مثلاً اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ عام مسلمانوں کی ایذاء رسانی جس فعل سے ہوتی ہو وہ قطعاً ممنوع ہے، جیسے عام گذر گاہ پر کنویں کا کھودنا یا کھانوں میں زہر ڈالنا یا ہمارے جدید زمانہ میں پانی کے اندر (متعدی امراض کے) جراثیم پھینکنا، ذرائع کی یہ ایسی قسم ہے جس میں مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی سد ذرائع کا مسئلہ وہاں بھی اجماعی ہے جہاں ان کی بنیاد نصوص شریعہ پر ہو، مثلاً اس قسم کے لوگوں کے معبودوں کو گالی دینا جن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ یہ سن کر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں گے۔ اسی طرح فقہاء کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی بات میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہوں مگر اس کے کرنے میں منفعت عامہ کا پہلو غالب ہو تو اسے ممنوع نہیں قرار دیا جائے گا، جیسے انگور کے درختوں کا لگانا۔ بے شک اس فعل کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگوروں کو نچوڑ کر ان سے شراب بنائی جائے لیکن اس طرح کا کام لینا احتمالی ہے۔ انگور کے درخت کاشت کرنے کی اصل غرض یہ نہیں ہوتی بلکہ اس شر کے مقابلہ میں منفعت عامہ کا امکان زیادہ ہے۔ اعتبار امرِ غالب ہی کا کیا جاتا ہے یا پھر اس چیز کا جس چیز پر رائج قائم ہو۔

ذرائع کے بارے میں اختلافی پہلو

مذکورہ بالا دونوں صورتوں کے علاوہ جو مسائل ہیں ان میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ دوسری جگہ کہیں بھی سدِ ذرائع کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی نظر احکام ظاہرہ پر رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں واقعہ جب ظہور میں آجائے اس وقت ظاہر الفاظ پر مبنی اس کی نوعیت دیکھی جائے گی، یعنی غایت اور مآل پر وہ غور نہیں کرتے چنانچہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> ''حکم ظاہر ہی پر لگایا جائے گا، غیب خدا کے سپرد ہے۔ جو شخص گمان اور اندیشہ پر حکم لگاتا ہے وہ اپنے اوپر ایسی ذمہ داری عائد کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نہیں ڈالی۔ امر غائب پر ثواب

۴۸۔ حافظ ابن قیم نے اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین ۳/۱۱۸، ۱۱۹، ۱۷۰۔ نیز المدخل إلی مذہب الامام احمد بن حنبل ص ۲۹۶

وعتاب کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ امورِ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو صرف اس پر مکلّف کیا ہے کہ وہ لوگوں کے افعال ظاہری پر احتساب کریں۔ باطن کی بناء پر کسی شخص پر حکم لگانا جائز ہوتو یہ حق سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جاتا''(۴۵)۔

یہی ظاہریت ہے جس پر امام شافعیؒ یہاں نہایت سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ وہ غایات امور پر جب کہ وہ ابھی وجود میں نہیں آئے، نہ ان کا ثبوت متحقق ہوا ہے، حکم لگانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ غایت اور مآل پر حکم لگانا، گمان اور ظن کی بناء پر حکم لگانا ہے، حالانکہ شریعت افعال کے ظاہر اور ان کی نوعیت پر حکم لگاتی ہے نہ کہ مآل اور محرکات پر، جب تک مآل اور محرکات پر کوئی قوی دلیل موجود نہ ہو۔

یہ نظریہ امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے نظریوں سے مختلف ہے۔ یہ حضرات غایت اور مآل پر نظر رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی جائز ''عقد'' (نکاح ہو یا بیع وغیرہ) کسی حرام کام کے ارادے سے ہو یا اس کا نتیجہ کسی ''امرِ محرم'' کی صورت میں ظاہر ہو، تو وہ نیت یا نتیجہ اس جائز کام کو حرام اور اس عقد کو باطل بنا کے رکھ دے گا۔

حنبلی مسلک کی ترویج و اشاعت۔ حلقہ اثر

اہل سنت کے فقہی مسالک میں چوتھا مسلک امام احمد بن حنبلؒ کی طرف منسوب ہے۔ زمانی ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ چوتھا فقہی مسلک ہے اور مقبولیت کے اعتبار سے بھی۔

فقہ حنبلی کے اثر و نفوذ پر گفتگو کرتے وقت یہ بات غور و فکر کی دعوت دیتی ہے کہ ایک ہزار برس سے زیادہ کے طویل عرصے میں آج تک کوئی دور ایسا نہیں آیا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ اپنے سے مقدم تین فقہی مسالک پر غالب آیا ہو۔ عہد ماضی میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس کے ماننے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہو۔ اگرچہ اس مسلک میں بڑے بڑے علماء پیدا ہوتے رہے اور ان کی قوتِ استنباط و استدلال کا دنیا نے لوہا مانا۔ جس دور میں اہل علم و فضل کی ہمتیں پست نظر آتی ہیں، اس دور میں بھی استنباط و استخراج احکام کے سلسلے میں علمائے حنابلہ کی حریت فکر ممتاز و درخشاں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان تمام اوصاف و خصائص کے باوجود عوام میں اس مسلک کے ماننے والوں کی تعداد ہمیشہ کم ہی رہی۔ کسی بھی خلاتے میں امت مسلمہ کے سوادِ اعظم کی حیثیت سے یہ فقہ حنبلی کے ماننے والے روشناس نہ ہو سکے، بجز اس کے کہ نجد اور حجاز میں اس مسلک نے کچھ مقام بنایا، مگر وہ بھی ابتدائی چند صدیوں میں نہیں بلکہ گزشتہ دو ڈھائی صدیوں میں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے قدرتاً ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس کے اسباب و علل کیا ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟ اہل فکر و نظر نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں اور اس کے اسباب کی نشان دہی کی ہے۔ علامہ ابن خلدونؒ اس کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

۴۵۔ کتاب الام ۴/۳۱۲

''امام احمد بن حنبلؒ کے مقلدوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا فقہی مسلک اجتہاد سے بُعد اور دوری رکھتا ہے۔ ان کے مسلک کی اساس اجتہاد سے زیادہ خبر و روایت کی پیروی اور تتبع پر ہے۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد حجاز، شام اور عراق تک محدود ہے۔ البتہ روایتِ حدیث اور حفظِ سنت میں یہ لوگ دوسروں سے ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں''(۵۰)۔

عوام میں یا مختلف اسلامی ملکوں میں فقہ حنبلی کے مقبول نہ ہونے اور اس کے اثر و نفوذ کے محدود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی کہ امام احمدؒ اور ان کے پیروکار علماء سرکاری مناصب سے دور رہے۔ انہیں سرکاری مناصب پر رہ کر فقہ حنبلی کی خدمت اور اس کی توسیع کے مواقع نہیں ملے۔ جب کہ حنفی، مالکی اور شافعی مسلک کا اتباع کرنے والے بعض ممتاز اہل علم اعلیٰ مناصب پر فائز رہے ہیں اور بعض مسلم حکومتوں میں حنفی مسلک یا شافعی مسلک کو ایک گونہ سرکاری حیثیت حاصل ہوئی اور عدالتی نظام ان دو مسالک کے مطابق چلایا گیا۔

حنبلی مسلک کی ایک نمایاں شخصیت علامہ ابن عقیلؒ کہتے ہیں:

''اس مذہب (حنبلی) سے خود اس کے حاملین نے انصاف نہیں کیا کیونکہ جس نے بھی علم میں کمال حاصل کیا وہی زہد و ورع کو اختیار کرتے ہوئے علمی شغل ترک کر کے گوشہ نشین ہو گیا، بخلاف حنفیہ اور شافعیہ کے کہ وہ حصول علم کے بعد مناسب عہدوں پر فائز ہو گئے اور اس طرح وہ عہدے ان کے درس و شغل اور شہرت کا سبب ہو گئے''(۵۱)۔

ایک اور سبب

عوام کے درمیان مسلک حنبلی کے عدم اشاعت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ امام احمدؒ کو اپنی زندگی میں اور ان کے متبعین کو ان کی وفات کے بعد جس قسم کے حوادث و مصائب سے دوچار ہونا پڑا، انہوں نے ردِ عمل کے طور پر حنابلہ میں عام طور پر حنبلی مسلک کے لیے شدت پیدا کر دی۔ یہ شدت و حمایت اگر اہل علم تک محدود رہتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی مگر یہ عام لوگوں تک پھیل گئی۔ علماء کے تعصب کو تو کسی نہ کسی حد تک دلیل کے دامن میں پناہ مل جاتی ہے، لیکن عوام کا تعصب انہیں الفاظ کا پابند بنا دیتا ہے۔ وہ پھر مفہوم و مقصد پر غور نہیں کرتے، الفاظ ہی پر قائم رہتے ہیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں خوارج (۵۲) کا

۵۰۔ مقدمہ ابن خلدون باب ۶، فصل ۷

۵۱۔ مناقب احمد بن حنبل ص ۵۰۵

۵۲۔ اسلام کے ایک قدیم ترین فرقے کے پیروکار جنہوں نے تصورِ خلافت اور ایمان و اعمال کے مسئلوں پر مخصوص نظریات وضع کر لیے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو استاذ ابوزہرہ کی کتاب ''اسلامی مذاہب''، مترجم پروفیسر غلام احمد حریری۔

تعصب بھی الفاظ ہی پر قائم تھا اور اس نے قتل و غارت کی فضا پیدا کر دی تھی اور وہ (خارجی) اس تعصب میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ مخالف عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کا خون انہوں نے حلال سمجھ لیا۔

حنابلہ میں اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کا مخصوص فکر خواص سے عوام میں منتقل ہوگیا۔ اپنے مسلک کی حمایت کے لیے شدت امام احمدؒ کے آخری دورِ حیات میں شروع ہو گئی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد تو یہ بہت بڑھ گئی۔ بغداد اور عراق میں حضرات حنابلہ کے اس تعصب نے بڑی نازک صورت پیدا کر دی۔ مناقشہ اور پیکار کا موضوع خلقِ قرآن کا مسئلہ تھا۔ حنبلی عوام نے اس موضوع پر واقفیت کے بغیر جھگڑنا شروع کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو شخص قرآن کے غیر مخلوق ہونے کا قائل ہو، اس کی بات قابلِ قبول اور اگر کوئی شخص اس مسئلہ پر تردد کا اظہار کرے، گو تحقیق کی غرض سے ہی کیوں نہ ہو تو اس کی بات رد اور ناقابلِ قبول۔ حنبلی مذہب کے بعض متشدد پیروکاروں کے اس رویہ نے حنبلی مذہب کو سخت نقصان پہنچایا اور اسے عوامی مقبولیت حاصل نہ کرنے دی۔

بلادِ اسلامیہ میں ایک اور سبب حنبلی مسلک کے پیروؤں کی تعداد کم ہونے کا یہ ہے کہ جب یہ مسلک پختت و پز کے مراحل طے کر رہا تھا، مختلف مسالک لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔

مصر میں حنبلی مسلک ساتویں صدی ہجری میں پہنچا، چوتھی صدی ہجری سے پہلے اس مسلک نے عراق سے باہر قدم نہیں نکالا۔ مغرب اور اندلس میں تو مالکی مسلک کا اس حد تک غلبہ ہوا کہ وہاں حنفی اور شافعی مسلک بھی فروغ نہ پا سکا۔ جنوبی ایشیا میں بھی حنبلی مسلک کا اثر و نفوذ نہ ہونے کے برابر ہے۔

طویل محرومیوں کے بعد یہ مسلک نجد و حجاز میں پہنچا اور وہاں اس کا اثر و رسوخ قائم ہوگیا، اس کا ذریعہ بھی حکومت ہی بنی۔ آج حجاز یعنی حکومت سعودیہ عربیہ کا سرکاری مذہب، فقہ امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق ہے۔ عدالتیں عموماً معاملات میں حنبلی مسلک سے رہ نمائی حاصل کرتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ امام شافعیؒ کا فقہی مسلک حنفی اور مالکی مسلک کے درمیان ہے۔ آپ میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث دونوں کے طریقوں کو متحد کرنے کی صلاحیت تھی۔

۲۔ امام شافعیؒ نے فقہ کے اصول وضوابط کو مربوط و مرتب کر کے کتابی شکل دی جس سے ان اصول وضوابط کو ایک علم اور فن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

۳۔ فقہ شافعی میں اصولِ اجتہاد کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ کتاب اللہ تعالیٰ

۲۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ اجماع

۴۔ قیاس

۴۔ امام شافعی استحسان اور مصالح مرسلہ کے شدید مخالف ہیں۔مصلحتِ مرسلہ کو صرف اس صورت میں قبول کیا جب وہ نص یا اجماع سے ثابت مصلحتِ معتبرہ کے مشابہ ہو۔آپ عمل اہلِ مدینہ کی حجیت کے بھی قائل نہیں ہیں۔

۵۔ فقہ شافعی کی ابتداء عراق سے ہوئی پھر حجاز، شام، خراسان اور ماوراء النہر میں یہ مسلک پھیل گیا۔مصر میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی جہاں آج بھی اس مسلک کا غلبہ ہے۔

۶۔ امام احمد بن حنبلؒ بہت زیادہ متبع سنّت تھے اور اجتہاد بالرائے سے احتراز فرماتے تھے۔

۷۔ آپ کو امام مجتہد سے زیادہ محدث مانا گیا ہے۔

۸۔ امام احمد بن حنبلؒ کے اصولِ اجتہاد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نصوصِ کتاب اللہ و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ اقوال صحابہ کرامؓ

۳۔ اجماع صحابہؓ جو ایسے مسائل میں ہو جن پر انہوں نے غوروفکر کے اور قرآنی و نبوی احکام کی روشنی میں ایک رائے کو منتخب کرنے کے بعد اسے معمول بنا لیا ہو۔

۴۔ قیاس، لیکن حدیث مرسل اور ضعیف حدیث کی موجودگی میں قیاس کو اختیار نہیں کرتے تھے۔

۵۔ استصحاب

۶۔ مصالح مرسلہ

۷۔ ذرائع

۹۔ فقہ حنبلی نے حجاز، شام، عراق اور مصر میں اپنے اثرات مرتب کیے۔

۱۰۔ آج کل سعودی عرب میں اس فقہ کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔

کُتب برائے مزید مطالعہ

۱۔ فلسفہ شریعتِ اسلام از ڈاکٹر صبحی محمصانی، مترجم مولوی محمد احمد رضوی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی (حصہ دوم) از علامہ راغب الطباخ، مترجم مولانا افتخار احمد بلخی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور

۳۔ آثار امام شافعیؒ از محمد ابو زہرہ مترجم رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور۔

۴۔ امام احمد بن حنبلؒ از محمد ابو زہرہ، مترجم رئیس احمد جعفری، ملک سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد۔

مصادر ومراجع

۱۔ ابن حجر عسقلانی، توالی التاسیس، مصر امیریہ بولاق ۱۳۰۱ھ

۲۔ فخر الدین رازی، مناقب شافعی، طبع مصر ۱۲۷۰ھ

۳۔ محمد اسلام مدکور، مناهج الاجتهاد، دارالنهضہ مصر ۱۹۶۰ء

۴۔ یوسف موسیٰ، ڈاکٹر، الفقه الاسلامی، طبع مصر ۱۹۵۸ء

۵۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، طبع مصر ۱۳۱۰ھ

۶۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد

۷۔ شافعی، امام، الرسالة

۸۔ شافعی، امام، کتاب الام

۹۔ ابن عبدالبر، الانتقاء

۱۰۔ ابو زہرہ، الامام الشافعی

۱۱۔ ابوزہرہ، امام احمد بن حنبل، مترجم رئیس احمد جعفری، ملک سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد ۱۹۸۶ء

۱۲۔ ذہبی، تذکرة الحفاظ

۱۳۔ ابن ندیم، الفهرست

۱۴۔ معروف دوالیبی، ڈاکٹر، المدخل إلی علم اصول الفقه، طبع ۱۹۴۹ء

۱۵۔ ابن قیم الجوزیہ، اعلام الموقعین

۱۶۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف

۱۷۔ عبدالقادر بن بوران، المدخل إلی مذهب الامام احمد بن حنبل، طبع بیروت ۱۹۸۱ء

۱۸۔ ابن جوزی، عبدالرحمٰن، مناقب احمد بن حنبل

مطبوعات

قانونِ اسلامی، اختصاصی مطالعہ: اصولِ فقہ (بذریعہ خط و کتابت)

(Advanced Correspondence Course in Islamic Jurisprudence)

☆☆☆☆☆

۱۔ علم اصول فقہ: ایک تعارف (حصہ اوّل)
۲۔ علم اصول فقہ: ایک تعارف (حصہ دوم)
۳۔ قرآن
۴۔ سنّت
۵۔ سنّت کی حجیت کا جائزہ
۶۔ اجماع
۷۔ قیاس
۸۔ شرائع سابقہ۔ اقوال صحابہؓ۔ استصلاح
۹۔ استحسان۔ استصحاب۔ استدلال
۱۰۔ عرف اور سدّ ذرائع
۱۱۔ حکم شرعی۔۱ (حکم تکلیفی)
۱۲۔ حکم شرعی۔۲ (حکم وضعی)
۱۳۔ خاص
۱۴۔ عام۔ مشترک۔ حقیقت و مجاز۔ صریح و کنایہ
۱۵۔ دلالات
۱۶۔ اسلام کا نظریۂ اجتہاد
۱۷۔ مناہج و اسالیب اجتہاد
۱۸۔ تقنین (اسلامی احکام کی ضابطہ بندی)
۱۹۔ پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل
۲۰۔ فقہ حنفی و فقہ مالکی
۲۱۔ فقہ شافعی و فقہ حنبلی
۲۲۔ فقہ جعفری و فقہ ظاہری
۲۳۔ قواعد کلیہ (حصہ اوّل)
۲۴۔ قواعد کلیہ (حصہ دوم)